ڈاکٹر سید شیراز علی زیدی*

# اقبال اور فیض کے فکری و فنی اشتراکات: ایک مطالعہ

**Abstract:** *Iqbal and Faiz are two prominent poets of this era. Both poets are native of the Sialkot city and their poetry motivates towards life. This article is not a comparative study of these poets in such a sense that one of them could be proved superior to other. Because the superiority of Iqbal is understood as Faiz himself admires Iqbal's art and intellect in his writings. But we cannot ignore the fact that Faiz got many influences of Iqbal that can be seen in his poetry from beginning to end. Even sometimes he adopted the same metaphors as that of Iqbal. This article consists of the study of common factors of their intellectual and artistic approach or in other words this article shows the influences of Iqbal's art and thoughts on Faiz.*

اقبال شاعرِ فردا ہیں اس لیے ان کے فنی و فکری اثرات ایک عہد تک ہی محدود نہیں ہیں۔ ہر عہد کے شعرا ان سے فنی و فکری رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔ انھوں نے فکر و فن کے بے مثال پیرائے مہیا کیے ہیں جن کی تقلید بھی کمالِ فن کی دلیل ہے۔ یہاں تقلید سے میری مراد فکر و فن کی چربہ سازی نہیں بلکہ اس کے انجذاب سے سوچ کی نئی جہتوں کی آبیاری ہے۔ اس معنی میں دو بڑے شعرا یعنی جوش اور فیض نے اقبال کے فن سے براہ راست اثرات قبول کیے ہیں۔ خطابیہ انداز، الفاظ کا شکوہ اور عمرانی فلسفے کو شعر میں ڈھال کر پیش کرنے کا ڈھنگ دونوں ہی شعرا نے غالب سے کم اور اقبال سے زیادہ سیکھا ہے۔ میں فی الحال یہاں فیض کے حوالے سے بات کروں گا۔ فیض اور اقبال کا اگرچہ کوئی مقابلہ یا موازنہ نہیں ہے لیکن کچھ چیزیں دونوں میں مشترک ہیں، ایک تو یہ کہ دونوں کا تعلق سیالکوٹ سے ہے اور دوسرا یہ کہ دونوں ہی زندگی کے متعلق اپنا ایک مخصوص فلسفہ اور نظریہ رکھتے ہیں۔ سیالکوٹ سے تعلق کی بدولت فیض کو اقبال کا مکانی قرب بھی حاصل تھا۔ فیض صاحب نے ساتویں جماعت میں اقبال کے استاد شمس العلما مولوی میر حسن کے مکتب میں ان سے عربی میں کسبِ فیض بھی کیا تھا (۱) اور ایک طرح سے اقبال کے ہم استاد بھی تھے۔ انھوں نے اقبال سے ملاقاتیں بھی کیں اور خود فیض کے بقول گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے انھوں نے اقبال ہی سے سفارشی خط لیا تھا۔(۲) یہاں ایک اور بہ ظاہر معمولی بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اقبال نے اپنے لندن قیام کے دوران شاعری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ فیض کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ماجرا ہوا۔ ''نقشِ فریادی'' شائع ہوئی تو اس کے دیباچے کی چند سطور نے پڑھنے والوں کو ایسا تاثر دیا جیسے کہ فیض کے پاس کہنے کو مزید کچھ نہیں رہا اور وہ شاعری ترک کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

*لیکچرر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

"پڑھنے والے ہراساں ہوگئے تھے کہ اب فیض شاعری سے دست کش ہو کر عزلت نشینی کی زندگی بسر کرنے کے درپے ہے۔اس کے موضعات کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ اپنے تمام تجربات اور احساسات کو "نقشِ فریادی" کے اشعار میں سمو کر وہ خالی ہاتھ ہو کر رہ گیا ہے اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ آئندہ شعر کہ کر وہ اپنے ہی خیالات کا مرتکب ہو گا۔۔۔۔"نقشِ فریادی" کی اشاعت کے بعد عرصے تک فیض کا سکوت اس شبہے کو یقین میں بدلتا رہا۔" (۳)

اقبال نے تو آرنلڈ کے مشورے پر شاعری ترک کرنے کا خیال چھوڑ کر اپنے لیے ایک راہِ عمل متعین کر لی تھی لیکن فیض کو غالباً خود ہی اس بات کا احساس ہو گیا ہو گا کہ ان کی شاعری میں وہ تاثیر موجود ہے جس کے ذریعے وہ اقبال کے بعد اپنی قوم کی رہنمائی اور کاروں کے دل میں احساسِ زیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ فلسفیانہ نکات کو شعر میں ڈھالنے کا فن اردو شاعری میں غالب نے متعارف کرایا اسی لیے خود اقبال نے اس کا اعتراف غالب کے نام اپنی ایک نظم میں کیا ہے:

فکرِ انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا

دوسری طرف فیض نے "نقشِ فریادی" میں "اقبال" کے عنوان سے نظم کہہ کر اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔اس نظم کے دو شعر دیکھیے:

تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں (۴)

فکر و خیال تک چند نگاہوں کے پہنچنے کا گلہ ظاہر ہے وہی شخص کر سکتا ہے جو خود ان تخیلات تک رسائی رکھتا ہو۔ فیض اقبال کے افکار تک یقیناً رسائی رکھتے تھے۔ وہ اقبال کو اس عہد کا سب سے بڑا شاعر مانتے اور (۵) اس پورے عہد پر اقبال کے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں۔(۶) اگرچہ انھوں نے اپنے ابتدائی دور کی شاعری پر براہِ راست اقبال کی بجائے اختر شیرانی کے، حسرت موہانی اور حفیظ کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔(۷) تاہم اقبال کے اثر کی ایک لاشعوری فنی و فکری رو ان کے ہاں "نقشِ فریادی" ہی سے نظر آنے لگتی ہے۔" نقش فریادی" کی نظم "کُتے" جو ان مصرعوں سے شروع ہوتی ہے:

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی

اقبال کی نظم " طارق کی دعا":

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

کی بحر میں لکھی گئی ہے اور بادی النظر میں اقبال ہی کی نظم کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ فیض کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اقبال کی پیروڈی کی ہے کیوں کہ یہ نظم مظلوموں کی عزتِ نفس کو بے دار کرنے کے لیے ایک مجبور انسان کی چیخ معلوم ہوتی ہے جو تضاد کے سہارے نشتر کی نوک کی طرح رگِ جاں میں اترتی چلی جاتی ہے لیکن یہ بہر حال اقبال ہی کے مثبت یا منفی اثر کا نتیجہ ہے۔ اقبال کے فنی و فکری اثرات "مرے دل مرے مسافر" تک صاف نظر آتے ہیں "مرے دل مرے مسافر" کی نظم "تین آوازیں" جسے ظالم، مظلوم اور ندائے غیب کے ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اقبال کی نظم "لینن خدا کے حضور میں"، "فرشتوں کا گیت" اور "فرمانِ خدا" کی تکنیک کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مظلوم خدا سے شکوہ کرتا ہے:

یا خدا یہ مری گردانِ شب و روز وسحر
یہ مری عمر کا بے منزل وآلام سفر

کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تو نے
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے

وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے

گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں

اب ندائے غیب آتی ہے:

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے

اٹھے گا جب جمعِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا(۸)

کیا اس نظم سے ذہن " تو عادل و قادر ہے مگر تیرے جہاں میں رہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات" اور " اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو / کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو" کی فکری و فنی جہت کی طرف راجع نہیں ہوتا؟ یہی نہیں بل کہ فیض، اقبال کی طرح بحر کو تخیل کی روانی میں حائل ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ اسی نظم کے پہلے بند کے چار مصرعے " جشن ہے ماتمِ امید کا آؤ لوگو" کے ارکانِ بحر فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ہیں اور اگلے دو مصرعوں "جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو / بستر خواب سے کیا چاہتے ہو" کے ارکان فاعلاتن فعلاتن فعلن میں ایک پورا رکن کم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد نظم پھر اسی بحر میں ہے اور آخری بند "ندائے غیب"، "ہر اک اولی الامر کو صدا دو / کہ اپنی فرِدعمل سنبھالے " میں بحر ایک بار پھر بدل جاتی ہے۔ اسی مجموعے کی ایک اور نظم " ہم تو مجبورِ وفا ہیں "(۹) بھی جو مربع کے چار بندوں پر مشتمل ہے، پہلے دو اور چوتھا بند "تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وفن"، "تیرے ایوانوں میں پرزے ہوئے پیماں کتنے" اور " ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں "فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان / فعلن کے ارکان پر مشتمل ہیں جب کہ تیسرے بند "بلا کشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا" کے ارکان مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔ فکر و خیال کے بہاؤ میں تبدیلی بحر کی یہ تکنیک اقبال ہی کی سنت ہے جو ان کے ہاں طویل نظموں میں نظر آتی ہے۔ جب کہ فیض نے مختصر نظموں میں بھی اسے استعمال کیا ہے۔

اقبال اور فیض کے ہاں ایک اور اہم مشترک چیز یہ نظر آتی ہے کہ دونوں نے اظہار کے لیے روایتی علامتوں، اشاروں اور استعاروں کو اپنایا اور انھیں جدید معنی عطا کیے۔ اقبال اور فیض کے ہاں رندی و زہد، گل و بلبل، قفس و آشیانہ، صبا و گلچیں، دار و رسن، حسن و عشق اور مے خانہ وغیرہ کی علامتیں اور استعارے پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں اور دونوں ہی نے اپنے اپنے نکتہ نظر کی ترجمانی کے لیے انھیں نئے مفاہیم عطا کیے ہیں۔ جدید ہونے کے باوجود روایت سے رشتہ نبھاتے ہوئے اسلوب کے نئے پیرائے اختیار کرنا اقبال اور فیض دونوں ہی کا خاصہ ہے۔ اقبال اور فیض کے علامتوں اور استعاروں میں بھی مماثلت موجود ہے۔ مثال کے طور پر اقبال شاعر کے لیے بلبل، وطن کے لیے چمن اور سام راج یا ملوک کے لیے گلچیں کا استعارہ لاتے ہیں۔ "بانگِ درا" کی نظم "تصویرِ درد " سے دو شعر دیکھیے:

اٹھائے کچھ ورق لالے نے،کچھ نرگس نے،کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغ بانوں میں (۱۰)

اب ''دستِ صبا '' کی غزلوں سے یہ دو اشعار دیکھیے:

چمن پہ غارتِ گل چیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے (۱۱)

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گل چیں بھی
بُوے گُل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے(۱۲)

گویا اقبال اور فیض کو اپنے اپنے عہد میں یہ احساس ہے کہ ان کا چمن گل چیں کی غارت گری کا شکار ہے اور انھیں اپنی صدا سے باغ بانوں کو بے دار کرنا ہے۔زندگی کے متعلق دونوں ہی کا نظریہ رجائی ہے۔اقبال کے کلام کو پڑھ کر جہاں جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے۔وہیں فیض کے اشعار پر آشوب دور میں بھی جینے کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔اقبال نے نسل اور قوم کے لیے کشتِ ویراں کی علامت تراشی ہے لیکن وہ اپنی کشتِ ویراں سے مایوس نہیں ہیں اور انھیں مٹی کے نم ہونے کا انتظار ہے۔فیض نے بھی یہی علامت استعمال کی ہے اور انھیں بھی یقین ہے کہ:

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابر و باراں (۱۳)

اقبال اور فیض دونوں ہی کی شاعری مستقلبیت کی شاعری ہے۔علامہ عقل کا انکار نہیں کرتے۔وہ عشق کو عقل کا پاسبان سمجھتے ہیں۔البتہ عشق و جنون کی فوقیت کے قائل ہیں:

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ رہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک (۱۴)

اسی طرح فیض بھی جنون کی فوقیت کے قائل ہیں:

انھی کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے (۱۵)

فنِ شاعری کے متعلق بھی اقبال اور فیض کے نظریے میں مماثلت موجود ہے۔ دونوں ہی فن اور فن کار کا ایک اخلاقی منصب متعین کرتے ہیں۔ فیض نے ''دستِ صبا '' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''شاعر یا ادیب کو دجلے میں قطرہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔ مزید بر آں اگر غالب کے دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی اسی دجلہ کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رخ، اس کے بہاؤ، اس کی ہیئت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمے داری بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔ یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گردو پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلے کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا، اس کی فنی دست رس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا، اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔۔۔۔ مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔'' (۱۶)

علامہ شاعر کو ''دیدۂ بینائے قوم'' قرار دیتے ہیں۔(۱۷) شاعری اور شعر کے بارے میں ''بانگِ درا '' کی ایک نظم ''شاعر'' میں کہتے ہیں:

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری
اہلِ سخن کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخن وری (۱۸)

غالب فلسفیانہ نکات کی شعر سازی میں یقیناً اقبال کے روحانی استاد ہیں مگر غالب زندگی کا کوئی مخصوص نظریہ پیش نہیں کرتے ان کے ہاں فلسفہ ہائے زندگی کی بو قلمونی ہے یہی غالب کی فوقیت بھی ہے جب کہ اقبال نظریہ سازی کی بدولت اپنی فکری حدود کا تعین کر دیتے

ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت فیض کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ فیض کے ہا ں بھی نظریاتی بنیادوں پر فکری حدود کا تعین موجود ہے۔ اقبال اور فیض دونوں ہی کی شاعری میں موضوعات کا دائرہ تنگ ہے اور یہ خصوصیت عام طور پر ان شعرا کے ہاں نظر آتی ہے جو کسی ایک مسلک یا مخصوص نقطہ نظر کی بدولت فکر کے ایک دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اقبال اور فیض کی شاعری میں موضوعات کی تکرار یقیناً موجود ہے لیکن یہ موضوعات نئے پیرائے اور نئے سانچے میں فنی جدت اور فکر کی تازگی کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ اس لیے ان کے موضوعات میں تکرار کے باوجود یکسانیت اور اکتاہٹ نہیں ہے۔

اقبال اور فیض دونوں کی شاعری کا مطالعہ کرنے والا ان کے اشعار سے ماحول کے اختلاف کے ساتھ سیاسی نظریہ بھی اخذ کر سکتا ہے، رومانیت بھی، انقلاب، بھی اور اشتراکیت بھی۔ اقبال اور فیض کے اشتراکی نظریے میں بھی کمال کی مماثلت موجود ہے۔ اقبال کے ہاں اشتراکیت ''الا اللہ'' میں ڈھل کر عین اسلام بن جاتی ہے۔ اسی لیے وہ الحاد پر مشتمل کمیونزم کا انکار کرتے ہیں لیکن سامراجیت، ملوکیت، آمریت، جاگیر داری، وڈیرہ شاہی اور غلامی کی مذمت اور کسان، مزدور اور عوام کی حمایت اور طرف داری اقبال کی شاعری میں کثرت سے موجود ہے۔ فیض کے ہاں بھی یہی موضوعات ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اقبال کا مقابلہ مغربی سامراج سے تھا اور فیض کا سامراج کی باقیات سے۔ اسی لیے دونوں کی شاعری میں ہر قسم کے سامراج کی غلامی سے کامل آزادی کا تصور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال اہلِ ہند کی غلامی پر کڑھتے ہوئے شکوہ کناں نظر آتے ہیں :

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

جاں بھی گِروِ غیر بدن بھی گِروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ ضِامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے (۱۹)

فیض بھی غلامی سے زیادہ غلامیت پسندی کے سخت مخالف ہیں اور ان کا لہجہ اقبال کی نسبت کہیں زیادہ تلخ ہے۔ نظم ''کُتے'' اسی شدید ذہنی جُھنجلاہٹ کی غماز ہے۔ چند شعر دیکھیے:

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتے
کہ بخشا گیا جن و ذوقِ گدائی

زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کی
جہاں بھر کی دُھتکار ان کی کمائی

یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں

کوئی ان کو احساسِ ذلت دلادے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلادے (۲۰)

اقبال یہ چاہتے تھے کہ ہند کے مسلمانوں کے قلوب میں آزادی کی لذت کو بیدار کریں تاکہ وہ متحد ہو کر ایک ایسی آزاد ریاست کے لیے کوشش کریں جس کا نقشہ انھوں نے ''خطہ لاہور'' میں واضح طور پر کھینچ دیا تھا۔

'' جہاں انسان کا معاشرتی رتبہ اس کی ذات، رنگ یا اس کی آمدنی کی مقدار سے نہیں بل کہ اس طرزِ زندگی سے جو وہ بسر کرتا ہے قائم کیا جاتا ہے۔ جہاں غریب امیروں پر ٹیکس عائد کرتے ہیں، جہاں انسانی معاشرہ شکم کی مساوات پر نہیں بل کہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو، جہاں کوئی اچھوت بادشاہ کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے، جہاں نجی ملکیت ایک امانت ہو اور جہاں سرمایہ اکٹھا کرنے کی اجازت نہ ہو کہ وہ دولت پیدا کرنے والوں پر چھا جائے۔ تاہم آپ کا یہ اعلا تخیّل مولویوں اور شریعت پرستوں کی دقیانوسی خیال آرائیوں سے رہائی کا طالب ہے۔''(۲۱)

فیض کی آنکھوں میں بھی کچھ ایسے ہی خواب سجے تھے۔ وہ بھی اقبال ہی کے پاکستان کا تصور دل و دماغ میں بسائے ہوئے تھے لیکن شومیٔ قسمت آزادی ملنے کے بعد بھی وہ آزادی حاصل نہ ہو سکی جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا۔ فیض بدلی ہوئی سرحدی لکیروں کو دیکھتے ہیں اور پھر اپنے سیاسی و سماجی ماحول سے حیران ہو کر پہلے تو شاید اقبال ہی کی روح سے مخاطب ہو کر نظم ''صبحِ آزادی ''میں کہتے ہیں:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر

چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں (۲۲)

اور پھر بے ساختہ اپنے ہم سفروں کو جھنجوڑتے ہوئے کہتے ہیں:

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی (۲۳)

اقبال اور فیض دونوں کی فکر میں اشتراکیت کا مادی پہلو کہیں نہیں ہے۔ دونوں کو خطرہ ہے تو صرف دقیانوسی مُلّائیت سے ہے۔ اقبال "ضربِ کلیم" کی ایک نظم توحید میں کہتے ہیں:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام (۲۴)

یہی گلہ فیض کو بھی ہے:

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے (۲۵)

ورنہ اقبال کی طرح فیض بھی تزئینِ در و بام ہی کا قصد لیے ہوئے تھے :

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے (۲۶)

اقبال اور فیض کے اشعار میں سرخیِ مے دراصل تزئینِ در و بامِ حرم ہی کے لیے ہے۔ اسی لیے اقبال علی گڑھ کے طلبا کو مخاطب کرتے ہیں تو فیض کے مخاطب ایران کے طلبا ہیں۔ اقبال ابی سینا پر نظم کہتے ہیں تو فیض افریقا کے لیے کڑھتے ہیں، اقبال فلسطین کے لیے نظمیں کہتے ہیں تو فیض فلسطین اور بیروت کے لیے نظمیں ہی نہیں کہتے بل کہ "مرے دل مرے مسافر" کا انتساب بھی آزادیِ فلسطین کے رہ نما یاسر عرفات کے نام کرتے ہیں۔ اقبال نے آزاد مسلم ریاست کی تجویز پیش کرتے ہوئے "خطبہ الہ آباد" میں واضح کیا تھا کہ اس آزاد ریاست کا قیام:

> "اسلام کے لیے ایک موقع فراہم کرے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو جائے جو عربی شہنشاہیت نے اس پر ڈال دیے تھے اور اپنے قوانین، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لا کر ان کی اصل روح اور عصرِ جدید سے رابطہ قائم کر سکے۔ "(۲۷)

اقبال کے نزدیک عربی شہنشاہیت کے اثرات سے پاک اسلامی ثقافت ہی آزاد سرزمین کا منشور ہے۔ فیض بھی محض معاشی مساوات کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک بھی تہذیب کا مسئلہ معاشی مسئلے سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ایک انٹرویو میں جب ان سے اس بارے میں سوال کیا گیا کہ: "کیا ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی بدحالی اور طبقاتی تقسیم نہیں؟ اس مسئلے کو نظر انداز کر کے کلچر کے مسئلے پر زور دینا کیا رجعت پسند قوتوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف نہیں؟"(۲۸) تو انھوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

> "کلچر کا مسئلہ ایسا ہی بنیادی ہے جیسے باقی معاملات ہیں، یہ بھی دیگر مسائل کا ایک حصہ ہے۔ اس کو معاشرے کے باقی ڈھانچے سے الگ کر کے سوچنا گم راہ کُن بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میدان میں اس وقت جو بھی کام ممکن ہو وہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کوئی سیاسی یا معاشی کام۔"(۲۹)

اور پاکستان میں کیسا کلچر ہونا چاہیے؟ پاکستانی کلچر کی تعریف فیض نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ظاہر ہے جو اثرات اسلامی عقائد اور روایات کی وجہ سے یہاں پہنچے ہیں انھیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بہت سی چیزیں دوسرے ممالک سے مشترک ہیں، کچھ ایسی ہیں جو مشترک نہیں ہیں، وہی ہمارے کلچر کی اصل بنیاد ہیں۔" (۳۰)

ایک انٹرویو میں ان سے پاکستان کے نظام کے بارے میں سوال کرتے ہوئے پوچھا گیا کہ آپ پاکستان کے لیے کون سا نظام پسند کرتے ہیں؟ چین یا روس والا سوشل ازم یا ڈنمارک اور بیلجیئم میں جو سوشل ازم ہے یا پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں تو انھوں نے فرمایا:

> " ہر ملک کا اپنا نسخہ ہے۔ اپنے اپنے حالات اور روایات کے مطابق ذہن میں رکھیں، اب ظاہر ہے پاکستان اسلامی ملک ہے تو بنیادی اصول تو اسلامی ہوں گے ۔۔۔ یعنی آپ اسے اسلامی سوشل ازم کہہ سکتے ہیں؟ کہہ سکتے ہیں کیوں نہیں کہہ سکتے۔۔۔ بہر حال یہ ایک نظام ہے اور جہاں اسلام ہو گا وہاں یہ اسلامی ہو گا اور جو ملک اسلامی نہیں ہو گا وہاں خالص سوشل ازم ہو گا۔"(۳۱)

اقبال اور فیض دونوں ہی پاکستان میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے علم بردار ہیں مگر دقیانوسی مُلّائیت کو اس کی راہ میں حائل سمجھتے ہیں۔ اقبال کی طرح فیض بھی کسی ملحدانہ اشتراکیت کے قائل نہیں ہیں۔ اقبال کے کلام کی طرح فیض کے اشعار میں بھی مزدوروں اور

کسانوں کے حق میں جب کہ سامراجیت وملوکیت کی ذہنی وجسمانی غلامی کے خلاف مزاحمتی اشعار ایسی اسلامی تہذیب کی عطا ہیں جو عرب ملوکیت کے اثرات سے پاک ہو اور ایسی ہی خالص اسلامی تہذیب کو وہ اسلامی سوشل ازم کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ میں نے اب تک اس مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فیض کی شاعری پر ابتدائی سے اقبال کے فکری وفنی اثرات موجود ہیں۔ دونوں کے فکری نظام میں وطن، عوام، سامراج، غلامی، آزادی اور ثقافت کے مسائل بنیادی نوعیت کے ہیں۔ اقبال اور فیض دونوں ہیں عرب ملوکیت کے اثرات سے پاک خالص اسلامی تہذیب کے داعی ہیں۔ دونوں کے ہاں اشتراکیت پر مبنی اشعار موجود ہیں لیکن یہ ملحدانہ اشتراکیت نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کے سیاسی وسماجی شعور سے مزین عین اسلام ہے۔ البتہ ایک بڑا فرق دونوں میں یہ موجود ہے کہ اقبال کی شاعری نے مسلمانان ہند کو بے دار کر کے ایک آزاد وطن کا حامل بنادیا مگر اقبال کی تعلیمات کے عملی نفاذ کے لیے فیض کی صدائے شعر ہنوز تشنہ گوشِ قلندر ہے۔

## حوالاجات:


۱۔ تونسوی، طاہر، ڈاکٹر، مرتب، انٹرویو، ''فیض احمد فیض ایوانِ وقت میں'' مشمولہ، ''فیض کی تخلیقی شخصیت: تنقیدی مطالعہ''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹، ص: ۳۴۲۔

۲۔ ایضاً، ص: ۳۴۷ ۳۔ ایضاً، احمد ندیم قاسمی، مضمون، ''فیض کا فن'' ص: ۱۶۔

۴۔ فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، لاہور، مکتبہ کارواں، جولائی ۱۹۸۴ء، ص: ۸۶۔۸۵۔

۵۔ تونسوی، ''فیض سے ایک گفتگو، انٹرویو، نصرت چوہدری، ص: ۳۶۹۔

۶۔ ایضاً، ص: ۳۷۱۔ ۷۔ ایضاً ۔ ۸۔ نسخہ ہائے وفا، ص: ۶۳۹۔۶۳۸۔

۹۔ ایضاً، ص: ۶۴۵۔۶۴۴۔

۱۰۔ اقبال، ''کلیاتِ اقبال، اردو''، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت، دوم، ۱۹۹۴ء، ص: ۹۹۔۹۸۔

۱۱۔ نسخہ ہائے وفا، ص: ۱۳۲۔ ۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۶۵۔ ۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۸۷۔

۱۴۔ اقبال، کلیات، ص: ۳۹۴۔ ۱۵۔ نسخہ ہائے وفا، ص: ۲۴۷۔ ۱۶۔ ایضاً، ابتدائیہ، ص: ۱۰۴۔۱۰۳۔

۱۷۔ اقبال، کلیات، ص: ۹۳۔ ۱۸۔ ایضاً، ص ۲۴۰۔ ۱۹۔ ایضاً، ص: ۶۶۳۔

۲۰۔ نسخہ ہائے وفا، ص: ۸۱۔۸۰۔

۲۱۔ اقبال، ''خطبہ لاہور''، مشمولہ، ''خطباتِ اقبال''، ترجمہ وتالیف، محمد جہاں گیر عالم، فیصل آباد، دائرۃ المعارف، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۰۶

۲۲۔ نسخہ ہائے وفا، ص: ۱۱۷ ۔ ۲۳۔ ایضاً، ص: ۱۱۸۔ ۲۴۔ اقبال، کلیات، ص: ۵۳۷۔

۲۵۔ نسخہ ہائے وفا، ص: ۱۷۸۔ ۲۶۔ ایضاً، ص: ۱۲۰۔

۲۷۔ اقبال، ''خطبہ الٰہ آباد''، مشمولہ، ''خطباتِ اقبال''، ص: ۶۳۔۶۲۔

۲۸۔ ''فکرِ فیض''، انٹرویو، مشمولہ، ''فیض کی تخلیقی شخصیت۔۔۔''، ص: ۳۲۳۔

۲۹۔ ایضاً۔ ۳۰۔ ایضاً، ص: ۳۲۲۔ ۳۱۔ ایضاً، ص: ۳۴۴۔۳۴۲۔